اردو کا منفرد غزل گو شاعر: حسرتؔ موہانی

پروفیسر فضل امام رضوی

451/203، امامیہ مارگ، جعفریہ کالونی، لکھنؤ (یوپی)، موبائل: 9415316152

غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ
طبعِ حسرتؔ نے اُٹھایا ہے ہر اُستاد سے فیضؔ

شیرینیِ نسیمؔ ہے سوز و گداز میرؔ
حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

حسرتؔ تری شگفتہ کلامی پہ آفریں
یاد آگئیں نسیمؔ کی رنگیں بیانیاں

طرز مومنؔ میں مرحبا حسرتؔ
تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرتؔ شاعری کا نام روشن ہوگیا

حسرتؔ مجھے پسند نہیں طرز لکھنؤ
پیرو ہوں شاعری میں جناب نسیمؔ کا

درج بالا قسم کے اشعار حسرتؔ نے کہے ہیں اور کسبِ فیوض کا اعتراف صمیم قلب سے کیا ہے۔ پھر یہ سوال لازمی طور پر اُٹھتا ہے کہ اس اعتراف کے باوجود حسرتؔ منفرد غزل گو کیوں کر کہے جاسکتے ہیں، لیکن ان کے اعترافات میں ہی اس کا جواب مضمر ہے۔ مستند اور معتبر شعرا کے رنگ و آہنگ سے مل کر حسرتؔ اپنی غزل میں ایک نیا رنگ بھرتے ہیں، یہی ان کی انفرادیت کی دلیل محکم ہے۔ ان کے استاد امیر اللہ تسلیمؔ نے بھی یہی بات دوسرے انداز سے کہی ہے:

میں ہوں اے نسیمؔ، شاگردِ تسلیمؔ دہلوی
مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

طرزِ لکھنؤ یا رنگِ لکھنؤ سے انحراف اور رنگِ دہلوی کی نمود— لیکن زبانِ لکھنؤ سے لگاؤ ہی حسرتؔ کی شاعری اور غزل کا بنیادی اور خصوصی پہلو ہے۔ جس میں جدّت ادا یا جدّت طرازی یا خیال آفرینی بھی نئی نہیں— لیکن اُن کی غزل میں جو ایک نیا تاثر اُبھر کر آتا ہے، وہی حسرتؔ کی غزل گوئی کا منفرد انداز ہے، جس سے انکار ممکن نہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ حسرتؔ نے ایک جگہ بھی کسی لکھنوی شاعر کا ذکر نہیں کیا ہے، نام لینا تو دور کی بات رہی۔ ہم عصر شعرا میں انھوں نے شادؔ عظیم آبادی، وحشتؔ، فانیؔ بدایونی اور طباطبائی کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ حسرتؔ کا مطالعہ صرف شعرائے اردو تک نہیں محدود تھا بلکہ فارسی کے مقتدر و معتبر شعرا کا کلام بھی اُن کے پیش نظر اور استفادے میں رہا ہے، جن کا ذکر اُن کے یہاں ملتا ہے جیسے:

ہم جامیؔ و حافظؔ کے بھی قائل ہیں پہ حسرتؔ
خوبی کو نہ پہنچا کوئی سعدیؔ کی غزل تک

یا

اردو میں کہاں ہے حسرتؔ
یہ طرزِ نظیریؔ و فغانیؔ

یہ طرزِ نظیریؔ و فغانیؔ کیا ہے؟ جسے حسرتؔ نے خصوصیت سے اپنایا ہے اور جو واقعاً حسرتؔ کی غزل گوئی کو منفرد بنا دیتی ہے۔ اس کے لیے خود حسرتؔ کا نقطۂ نظر ملاحظہ ہو۔ حسرتؔ نے 'انتخاب سخن'، 'معائب سخن' اور 'نکات سخن' کے تعلق سے ایک پوری سیریز شائع کی تھی۔ بہرحال ''مکتوبات امیر مینائی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے انتقادی مطمح نظر کو واضح کیا تھا۔ وہ امیرؔ و داغؔ کی شاعری کا تقابل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''عاشقانہ شاعری کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل وہ جس میں جذباتِ شوق کی صحیح کیفیت نگاہِ حق شناس کے رُوبرو عشق کو خود نمائی کی اس شان میں پیش کرتی ہے کہ جس کی نسبت نظامیؔ نے ''ہواللہ'' فرمایا اور جس کو مولانا رومؔ نے اپنی تمام علّتوں کی دوا قرار دیا۔ ایسی شاعری کی ایک سرحد

تصوف اور عشقِ حقیقی کے قریب اور دوسری عشق مجازی اور پاک محبت سے ملحق ہوا کرتی ہے۔ اُردو زبان میں تصوف اور عشق حقیقی کا مذاق شاذ ہے۔ البتہ محبت کے جذبات میر و مصحفی یا درد و قائم کے کلام میں اکثر پائے جاتے ہیں۔

عاشقانہ شاعری کی دوسری قسم وہ ہے جس میں پاک اور بے لوث عشق کے بجائے ہوس پرستی کے جذبات کی صحیح تصویر کھینچی گئی ہو، جس کے نمونے جرأت، میاں نظیر اور انشا کے کلام میں بکثرت ملتے ہیں۔''

(اردوئے معلّٰی، حسرت موہانی، مکتوبات امیر مینائی، ص: ۱۸، اپریل ۱۹۱۱ء)

درج بالا بیان کی روشنی میں حسرت کی غزل گوئی کے اہم پہلوؤں کی تفہیم آسانی سے ہوسکتی ہے۔ دراصل خواجہ الطاف حسین حالی نے غزل پر جو اعتراضات کیے تھے جس کا اصلاحی اور افادی پہلو ضرور اہم ہے، لیکن حالی نے ادب کے وسیع اغراض و مقاصد کو نظر انداز کر دیا تھا۔ حالی کا یہ فرمانا کہ غزل حسن و عشق کے معاملات کی شاعری ہے۔ عشق عقل اور اخلاق دونوں کو خراب کر دیتا ہے، لیکن حالی کی اس نکتہ چینی کو کسی نے بھی نہیں قبول کیا اور کاروانِ غزل آج تک رواں دواں ہے اور حسرت کی غزل گوئی اسی محدود زاویۂ نظر کا مثبت ردِ عمل ہے۔ ظاہر ہے کہ سرسید کی اصلاحی تحریک کے سبب حالی اور آزاد نے جدید نظم نگاری کی لَے کو تیز کیا، لیکن غزل کی ترقی کچھ دیر کے لیے رُک سی گئی تھی جسے حسرت نے اپنی سعی اور افتادِ طبع سے نئی زندگی عطا کی۔ یہ سچ ہے کہ حسرت کی غزل گوئی میں قدیم انداز بھی جھلکتا ہے، لیکن انھوں نے قدیم و جدید کے امتزاج سے اردو غزل کی آبیاری کی ہے۔ انھوں نے اردو غزل کی تاریخ کی سمت و رفتار میں نئی روح پھونک دی۔

واضح رہے کہ جو عہد حسرت کی شعر گوئی کی ارتقائی منازل کا تھا، اس میں اردو غزل مائل بہ انحطاط تھی۔ شعرائے لکھنؤ کا روایتی اور رسمی طرز، غزل کو پستی کی طرف دھکیل چکا تھا۔ روایتی شعرا کی روایتی فکر کے باعث غزل اپنی قوتِ تخلیق کھو چکی تھی اور نئے ذہن و فکر کے شعرا غزل کو تج کر نظم نگاری کی طرف بہت شدّ و مد سے مائل ہو رہے تھے۔ یہ حسرت موہانی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ ان مساعد حالات میں غزل کو جادۂ صداقت پر گامزن کر دیا اور اردو شعرا سچ بولنے کی طرف مائل ہوئے۔ حسرت کی غزل میں جذبات کا اظہار بے ساختہ مگر سلیقے سے ہوا ہے، جس میں ایک کیف ایک سرور اور والہانہ پن ہے۔ ان کے اشعار دل میں گدگدی بھی پیدا کرتے ہیں، چٹکی بھی لیتے ہیں، لیکن سیری نہیں ہوتی۔ انھوں نے غزل کی فرسودگی کو تازگی سے ہم کنار کیا ہے، جس میں سادگی اور معصومیت کا عنصر نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو:

تجھ سے وہ ملا شوق سے اور تو نے نہ جانا
حسرت کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانا

ہے ایک در پیر مغاں تک تو رسائی
ہم بادہ پرستوں کا کہاں اور ٹھکانا

اب عشق کا وہ حال، نہ ہے حسن کا وہ رنگ
باقی ہے فقط عہدِ تمنّا کا فسانا

آتی ہے تیری یاد تو حسرت کو شبِ غم
ہر بار اُسے افسانۂ دل کہہ کے سُنانا

یہاں میں دیگر شعرائے غزل سے حسرت کا تقابل تو نہیں کرنا چاہتا ورنہ مضمون طویل ہو جائے گا اور نہ تو دبستان دہلی اور لکھنؤ کے امتیازات کی نشاندہی کر کے بحث کو اُلجھانا چاہتا ہوں، لیکن یہ ضرور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ امیر اور داغ نے زبان کو جہاں عام فہم اور سلیس و سادہ بنایا، وہیں ابتذال اور رکاکت بھی بڑھا دی تھی، جس سے باذوق قارئین بخوبی واقف ہیں۔ اسی لیے حسرت نے بار بار غالب، مصحفی، میر، مومن اور نسیم کا ذکر کیا ہے اور حسرت کے درج ذیل اشعار اردو غزل کو نیا رُخ دیتے ہیں:

ستم ہو جائے تمہید کرم ایسا بھی ہوتا ہے
محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

حال کھل جائے گا بیتابیٔ دل کا حسرت
بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

مجھ کو اتنا ہی تم سے اُنس بڑھا
جس قدر تم کو اجتناب ہوا

آرزو تیری برقرار رہے
دل کا کیا ہے رہا، رہا نہ رہا
آپ کو اب ہوئی ہے قدرِ وفا
جب کہ میں لائقِ جفا نہ رہا

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

حسرتؔ کے کچھ اشعار تو زبان زد خاص و عام ہیں جواب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، مثلاً:

جنوں کا نام خرد پڑ گیا، خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے
دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

یہ بھی اک چھیڑ ہے کہ قدرت نے
تم کو خود بیں، ہمیں غیور کیا

لاکھوں ہیں تری دید کے مشتاق مگر ہم
محروم، تجھے دل سے بھلانے میں لگے ہیں

ایک ہی بار ہوگی وجہ گرفتاریٔ دل
التفات اُن کی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا

دِل کچھ اس ڈھب سے لیا اُس نے کہ برسوں کوئی
حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا

حسرتؔ طرز میرؔ اور اندازِ میرؔ کے شیدائی تھے جس کا اظہار بھی اُنھوں نے کیا ہے:

شعر میرے بھی ہیں پُر درد و لیکن حسرتؔ
میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

میرؔ کا شیوۂ گفتار اور اُس کی اہمیت اور تاثیر اپنی جگہ ہے، لیکن میرؔ کے رنگِ تغزل اور حسرتؔ میں فرق ہے۔ میرؔ سراپا سوز ہیں، حسرتؔ سوز اور ساز دونوں ہیں۔ میرؔ کے یہاں درد ہے، مگر حسرتؔ کے یہاں درد کے ساتھ شیرینی بھی ہے۔ میرؔ کے یہاں عشق ہے، لیکن حسرتؔ کے یہاں عشق کے ساتھ مستی اور سرمستی دونوں ہیں۔ حسرتؔ کے یہاں گریہ، آہ و بکا بھی ہے تو اس میں دلکشی اور دل ربائی کے سامان ہیں۔ حسرتؔ کی عاشقی میں رات دن آنسو بہانے میں بھی ایک کیف و مستی اور سرشاری ہے۔ حسرتؔ کے رونے میں ہمسائے کی نیند نہیں اُڑتی بلکہ یہ اضطراب و بیقراری انہی تک محدود رہتی ہے۔ مختصر یہ کہ حسرتؔ کے یہاں حرماں و یاس میں بھی اُمید کی کرن زندگی کے آثار پیدا کرتی ہے اور ان کی غزل کے اشعار زخم خوردہ دلوں کے لیے مرہم بن جاتے ہیں۔ شعر کی عمدگی اور دلکشی اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ سننے والے اور پڑھنے والے کے دل و دماغ کو مضطرب کر دے اور صرف اضطراب ہی نہ پیدا کر دے بلکہ دلوں کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جائے۔ جیسا کہ حسرتؔ خود فرماتے ہیں:

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ
سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

شمس قیس رازی نے المعجم فی معاییر اشعار العجم میں شعر سے بحث کرتے ہوئے صراحت سے لکھا ہے کہ 'شعر کہہ لینے کے بعد شاعر کا فرض ہے کہ وہ اشعار پر غور کرنے کے بعد طے کر لے کہ ان کی تقدیم و تاخیر کی کیا کیفیت ہوگی۔' ظاہر ہے کہ اس طرح غزل میں ایک تسلسل قائم رہتا ہے اور یہ تسلسل منطقی نہیں بلکہ تاثر کی وحدت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حسرتؔ نے غزل میں وحدت تاثر کو بہر حال قائم رکھا ہے۔ یہی وحدتِ تاثر حسرتؔ کی غزل گوئی کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اگر غزل کے ہر شعر کو اکائی تسلیم کر لیا جائے تو بھی حسرتؔ کی غزلوں میں مجموعی طور پر ایک تاثر قائم رہتا ہے۔ جسے آج کل بہت سے ناقدین موڈ (Mood) سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

صنفِ غزل اور انسانی سماج میں بڑی یکسانیت ملتی ہے۔ جیسے سماج میں فرد اور خاندان اکائی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ جسے اپنی کتاب 'Society' میں Maciver & Page نے کہا ہے:

"Family is the fendamental unit the society" پھر بھی یہ اکائی، اجتماعی سماج سے مربوط رہنے پر مجبور ہوتی ہے اور ایک معنوی رابطہ بہر طور اُستوار رہتا ہے۔ غزل بھی اشعار کا اجتماع ہوتی ہے۔ ہر شعر منفرد ہونے کے باوصف ایک تسلسل رکھتا ہے۔ یہی حسن تناسب حسرتؔ کی غزل گوئی میں ممتاز اور منفرد ہے۔ اُن کی بیشتر غزلیں ایک ہی موڈ یا تاثر کی ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا کہ موڈ (Mood) کیا ہے؟ لغاتِ نفسیات میں Mood کی تعریف حسب ذیل ہے:

"Mood: An effective condition or attitude, ending for some time characterised by particular emotions in a condition of Mobilization, so as to be reading erobed e.g, an irritable mood or a cheerful mood."

یعنی موڈ ایک ایسی کیفیت، حالت یا رُجحان طبیعت ہے جو مؤثر ہو، کچھ دیر برقرار رہے، اُس سے مخصوص جذبات وابستہ ہوں، جس کی نمود

ہیجان کے ذرا دب جانے پر ہو، یہ کیفیت لمحاتی نہیں ہوتی بلکہ ایک مخصوص وقفے پر حاوی ہوتی ہے۔ یہی کیفیت غزل میں بھی ہوتی ہے۔ غزل جذبے کے اظہار کی شاعری ہے۔ غزل میں ایک مکمل مزاجی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ حسرتؔ کی غزل گوئی میں یہی مزاجی کیفیت ملتی ہے، جس میں اُن کا مسلکِ عشق ڈھلا، رچا اور بسا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

مسلکِ عشق ہے پرستشِ حسن
ہم نہیں جانتے عذاب و ثواب

حسرتؔ کا مسلکِ عشق اُن کی غزل میں مختلف انداز سے ایک مزاجی کیفیت میں ڈھل کر سامنے آتا ہے، جس میں ایک موڈ (Mood) کی غزلیں ملتی ہیں۔ وہ سری کرشن سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے جوان کی غزلوں سے ظاہر ہے۔ ملاحظہ ہو:

آنکھوں میں نور جلوۂ بے کیف و کم ہے خاص
جب سے نظر یہ اُن کی نگاہِ کرم ہے خاص
کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ ہے حضرتِ کرشن
اقلیم عشق آپ کا زیر قدم ہے آج

حسرتؔ کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے آج

یا

عرفانِ عشق نام ہے میرے مقام کا
حاصل ہوں کس کے نغمۂ ''نے'' کے پیام کا

متھرا سے اہل دل کو وہ آتی ہے بوئے اُنس
دنیائے جاں میں شور ہے جس کے دوام کا

مخلوق اک نگاہِ کرم کی اُمیدوار
مستانہ کر رہی ہے بھجن رادھے شیام کا

گوکل کی سرزمین بھی عزیز جہاں بنی
کلمہ پڑھا جو اُن کی محبت کے نام کا

برندا کا بن بھی رُوکشِ جنت بنا کہ تھا
پامالِ ناز انھیں کے بہارِ خرام کا

یا

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا
دم بھرتی ہے آرزو کسی کا
ہر ذرّہ سرزمین گوکل
دارا ہے جمالِ دلبری کا
برسانا و نند گاؤں میں بھی
دیکھ آئے ہیں جلوہ ہم کسی کا
پیغام حیاتِ جاوداں تھا
ہر نغمہ کرشن بانسری کا
وہ نور سیاہ تھا کہ حسرتؔ
سرچشمہ، فروغِ آگہی کا

یہ غزلیں ایک ہی موڈ (Mood) کی ہیں، جس میں وحدت تاثر قائم ہے۔ یہی حسرتؔ کی غزل گوئی کی شناخت ہے جو انھیں اُردو کے دیگر غزل گویوں سے ممتاز بنا دیتی ہے۔ جب وہ فرماتے ہیں:

گرفتارِ محبت ہوں اسیر دامِ اُلفت ہوں
میں رُسوائے جہان آرزو ہوں یعنی حسرتؔ ہوں

عجب انداز ہے میرے مزاجِ لا اُبالی کا
نہ ممنونِ تمنا ہوں، نہ مشتاقِ زیارت ہوں

مرا شوق سخن پروردۂ آغوشِ حرماں ہے
میں خود شیدائے غم ہوں، رفیقۂ دردِ محبت ہوں

ہر شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے اور پوری غزل وحدتِ تاثر کی ضامن ہے۔ ہر شعر میں غم کی خلش بھی ہے اور خلش میں شیرینی بھی۔ بلند حوصلگی نے ضبط و صبر اور تحمل پیدا کر دیا ہے، لیکن جذبات اُسی طرح سے متلاطم ہیں۔

دوسری سب سے اہم خوبی ان کی غزل گوئی کی یہ ہے کہ وہ روا روی میں بھی دبستانِ مومنؔ کے نمائندہ شاعر نسیمؔ دہلوی کے رنگِ بیاں سے جدا نہیں ہوتے، جس سے اُن کے یہاں نازک خیالی اور فکر کی تازگی باقی رہتی ہے:

حسرتؔ روا روی میں بھی اتنا رہے خیال
اشعار میں نسیمؔ کا رنگِ بیاں رہے

حسرتؔ کی غزلوں میں پہیلیاں معمّا یا چیستانیں نہیں کہ اُسے بوجھنے کے لیے سرگرداں ہونا پڑے۔ اُن کا تشبیہاتی اور استعاراتی نظام

صاف اور سادہ، لیکن پُرکاری لیے ہوئے ہے۔ وہ زبانِ لکھنؤ میں رنگِ مومنؔ خاں دہلوی کو خوشنما پیکر میں بڑے مؤثر ڈھنگ سے ڈھال دیتے ہیں اور اپنے کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے مختلف انداز میں پیش کر کے منفرد انداز کے حامل بن جاتے ہیں۔ درج بالا مثالیں اس بات کا مدلل ثبوت ہیں کہ حسرتؔ کے یہاں غزل کی فکری سالمیت، وحدت، کلیت اور فنّی حسن کا راز پنہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ غزل کی وحدت کا وجود کثرت میں مضمر ہے اور وحدت کا تاثر اُسی وقت تک قائم رہے گا جب تمام اشعار اسی تہذیب و ترتیب سے پڑھے جائیں جیسا کہ شاعر نے پیش کیے ہیں۔

حسرتؔ غزل کے امام نہیں بلکہ مجدّد ہیں۔ اگر حسرتؔ نے غزل گوئی کی طرف توجہ نہ کی ہوتی تو غزل اب تک مٹ چکی ہوتی۔ غزل کے خلاف جو محاذ قائم کیا گیا تھا، اس کا سدّ باب حسرتؔ کی جدّت طرازی نے کیا۔ شاعری کی اصلاح کے متعلق ان کی تصنیف ''نکاتِ سخن'' مختصر ہونے کے باوجود اعلیٰ درجے کا تحقیقی اور تنقیدی عمل ہے۔

حسرتؔ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی جس نے انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز کر دیا ان کی زبان اور الفاظ کی بندش ہے۔ وہ معاملہ بندی میں جرأت اور مومنؔ کی پیروی کرتے تھے، لیکن نازک خیالی اور واردات محبت میں مومنؔ اور غالبؔ کا انداز اختیار کیا، سوز و گداز میں میرؔ کا اتباع کیا، لیکن لطفِ سخن، زبان، محاورہ بندی میں وہ فصیح الملک مرزا داغؔ سے بھی سبقت لے گئے۔ حسرتؔ کی زبان نہایت شستہ اور پُر اثر ہے۔ چند ایسے اشعار میں پیش کرتا ہوں جو حُسنِ زبان اور حسن بندش کے بہترین نمونے ہیں اور شاید ایسی زبان حسرتؔ کے سوا اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں مل سکے گی:

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

عرض کرم پہ ترک جفا بھی نہ کیجیے
ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجیے

تعزیر کے قابل نہیں گستاخیِ ارماں
اس راہ پہ جب تو نے چلایا تو چلا میں

اس قدر جلد جو پہچانِ وفا توڑ دیا
آپ ہی کہیے بھلا آپ کو زیبا ہے یہی

جس کی ذلّت میں بھی عزت ہے سزا میں بھی جزا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے محبت کیا ہے

عمر ہی کیا ہے وہ کم سن ہیں ابھی نامِ خدا
اُن پر مرنا ہے تو کچھ دن ہمیں جینا ہے ضرور

دوستو! ترکِ محبت کی نصیحت ہے فضول
اور نہ مانو تو دِلِ زار کو سمجھا دیکھو

حسرتؔ کی شعری جمالیات فکر و فن کو ہم آہنگی عطا کرتی ہیں۔ وہ عشق کی نزاکتوں اور حسن کی اداؤں کے رمز شناس ہیں، اسی لیے ان کی غزلوں کو ایمائیت و رمزیت اور دلکشی کا حسین مرقع قرار دیا گیا ہے۔

◆◆◆

اردو میں بارہ ماسے کی روایت

اردو میں کلاسیکی شاعری کی ابتدا شمالی ہند میں افضل کے بارہ ماسے سے ہوئی ہے۔ بعد میں دوسرے کئی شعرا نے بھی بارہ ماسے لکھے۔ بارہ ماسوں کا مطالعہ اردو زبان کے ارتقائی مراحل کو سمجھنے اور اس کے علاقائی رشتوں کو جاننے میں بہت معاون ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے بارہ ماسے اس کتاب میں یکجا کر دیے ہیں۔ آغاز کتاب میں مبسوط و مفصل مقدمے کے علاوہ ہر بارہ ماسے کا تعارف اور اس کا تنقیدی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، صفحات: ۳۸۷، (دوسرا ایڈیشن) قیمت: ۱۲۰ روپے

اردو اکادمی، دہلی